ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

احمد فراز کی غزل میں دریا کا استعارہ

METAPHOR OF RIVER IN AHMED FARAZ GHAZAL

زینب شہباز
ایم فل سکالر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد
ڈاکٹر طیبہ نگہت
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

Abstract:
Urdu ghazal is one of the most widely spoken genres in history. There is no precedent for the popularity and effectiveness of ghazal. The skill of saying the greatest thing in a poem of two syllables has been characteristic of Urdu poets. Closing the river in a jar and closing the philosophical thought on the topics of the universe is the work of our poets ghazals. Nature has endowed Ahmad Faraz with the essence that is capable of reaching the bottom of every cell. He often uses metaphors of flowers, mountains, rivers, seas, etc. in his poetry. Often our consciousness becomes so engrossed in the glimpse of our objective and thematic, external and internal experiences that we do not look up to its other colors. Ahmed Faraz is well aware of this fact. Therefore, they do not just go through the first glimpse, but look at such a thing over and over again and when they describe it, along with the depth of thought, an aesthetic way of thinking is created in it.

Key words: Ahmed faraz, Poetry, Metaphor, River, Sea, Urdu ghazal

احمد فراز اردو شاعری میں بلند حوصلوں کے علمبر دار شاعر کی حیثیت سے شمار ہوتے ہیں۔ احمد فراز دورِ جدید کے ان نمائندہ شاعروں میں سے تھے جنہوں نے زندگی کو محض سامانِ آرائش کے حصول کا نام نہیں دیا بلکہ اپنی غزلوں میں بتایا کہ زندگی حسنِ سیرت کا نام ہے۔ احمد فراز کی غزلیں جذباتی تہذیب، فکری ترفع اور فنی تکمیل کی عکاس ہیں۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے کہیں بھی یہ احساس دامن گیر نہیں ہوتا کہ ہم مملکتِ شعر میں قدم دھرنے والے ایک ناآشنائے مزاجِ سفر راہرو سے ہم کلام ہو رہے ہیں۔

احمد فراز کو قدرت نے وہ جوہر عطا کیا ہے جو ہر حجرے کی تہہ تک پہنچنے کی قدرت رکھتا ہو۔ وہ اپنی شاعری میں پھولوں، پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں وغیرہ کے استعارے کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ اکثر ہمارا شعور ہمارے معروضی و موضوعی، خارجی و داخلی تجربات کی جھلک سے اس حد تک سرشار ہو جاتا ہے کہ ہم اس کے دوسرے رنگوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ احمد فراز اس حقیقت سے خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لیے وہ پہلی جھلک پر ہی گزارہ نہیں کرتے بلکہ ایسی چیز کو بار بار دیکھتے ہیں اور پھر بیان کرتے ت وقت اس میں فکری گہرائی و گہرائی کے ساتھ جمالیاتی طرزِ فکر بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

کذب کی ریگ رواں یوں ہے کہ اس کے آگے دیکھو
خشک ہوتا ہوا دریائے صداقت دیکھو(۱)

احمد فراز نے دریا کا استعارہ صداقت کے صفوں میں استعمال کیا۔ نئے آفاق تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ احمد فراز کی شاعری نے انسان میں وہ احساس پیدا کیا کہ ہر انسان اپنی جگہ اپنا الگ نام بنا سکتا ہے اور یہ احساس ان دلوں کو توانائی فراہم کرتا ہے جن پر مہر لگ چکی ہے اور دنیا کی حقیقت سے روشناس کرواتا ہے۔ کہتے ہیں:

اس دریا سے آگے سمندر بھی ہے
اور وہ بے ساحل ہے یہ بھی دھیان میں رکھنا(۲)

یہاں احمد فراز ہے دریا اور سمندر کا استعارہ ایک ہی جگہ پر استعمال کیا اور ساحل کا بھی استعارہ ہے۔

ہر تماشائی فقط ساحل سے منظر دیکھتا

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

کون دریا کو الٹتا کون گوہر دیکھتا(۳)

احمد فراز دنیا کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ دنیا صرف تماشا دیکھنے والی ہے۔ اگر کوئی انسان محنت کرے تو اس کو کوئی درد نہیں رہتا نہ ہی اس موتی کی کوئی جانچ کرتا ہے۔ صرف ناکامیوں کا تماشا دیکھتی ہے یہ دنیا ایک اور جگہ پر انسانی عقل کے ختم ہونے پر افسوس کرتے ہیں۔

اس دور بے جنوں کی کہانی کوئی لکھو
جسموں کو برف ، خون کو پانی کوئی لکھو(۴)

کہہ رہے ہیں کہ اس دور میں جدھر انسان اپنی عقل کھو بیٹھے ہیں۔ اس کہانی کو کوئی رقمطراز کرے، لیکن یہ بات شرط ہے کہ انسانی جسموں کو برف لکھ دے کیونکہ ان میں احساس کے نام کی کوئی چیز نہیں۔ وہ اس عمل سے بہت زیادہ غمزدہ ہیں۔ اس سے ربانی کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ خون کا پانی کہہ دیا ہے۔

احمد فراز اپنے آپ کو مجبوری کا نام بھی دیتے ہیں کہ ان پر مجبوری کا عالم بھی آتا ہے۔

مجبور تھے لے آئے کنارے پہ سفینہ
دریا جو ملے ہم کو وہ پایاب بہت تھے(۵)

اس شعر میں وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم مجبور تھے اور دریا کے کنارے پر اپنی یادداشتیں ڈبونے کے لیے آ گئے۔ لیکن ہمیں جو دریا ملا اس میں گہرائی نہ تھی۔

اپنے دکھ، درد کی کیفیات کو بھی ایسے اچھوتے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ وہ قاری کے ذہن پر اثر ضرور کرتا ہے۔ کہتے ہیں:

اک درد کا پھیلا ہوا صحرا ہے کہ میں ہوں
اک موج میں آیا ہوا دریا ہے کہ تم ہو(۶)

احمد فراز اپنے درد، دکھ کو ایک صحرا کی مانند قرار دے رہے ہیں کہ بس میں پانی درخت، گھاس وغیرہ کچھ بھی نہ ہو اور دریا کے استعارے کو وہ محبوب کی خوش روانی سے ترجیح دے رہے ہیں کہ تم جس طرح سے موجیں روانگی سے چل رہی ہیں ویسے ہو۔

ایک اور جگہ اپنے درد کی کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں کہ

کشتیٔ جان ہے کہ ڈوبے چلی جاتی ہے فراز
اور ابھی درد کا دریا نہیں طغیانی پر(۷)

یہاں بھی انہوں نے دریا کا استعارہ اپنے درد کے وسیع ہونے کے لیے بیان کیا ہے۔ خود کو درد کی کیفیت میں مر جانے کی حد تک لے جاتے ہیں کہ

پکارتے رہے محفوظ کشتیوں والے
میں ڈوبتا ہوا دریا کے پار اتر بھی گیا(۸)

احمد فراز کہہ رہے ہیں کہ کشتیوں والے پکارتے رہے کہ محفوظ رہو لیکن میں ڈوبتا رہا اور مرنے کی کیفیت میں دریا کے پار اتر گیا۔

وہ اپنے محبوب کی تعریف بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

دیکھو تو کوئی اس کو کہ جوں موج میں دریا
ہر اک سے لگاوٹ بھی روانی میں بھی اپنا(۹)

اپنے محبوب کی تعریف میں اس کے حسن کو دریا کی موج کہہ رہے ہیں کہ اسے پر ایک سے لگاوٹ بھی ہے اور موجوں کی طرح روانی بھی ہے۔

یوں تو میخانے میں مے کم ہے نہ پانی کم ہے
پھر بھی کشتیِ صبا میں روانی کم ہے(۱۰)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

احمد فراز اپنے محبوب سے ہم کلام ہو رہے ہیں کہ یوں تو شراب خانے میں نہ ہی شراب کم ہے اور نہ پانی کی کمی ہے پھر بھی شراب میں پانی کا بہاؤ بہت کم یا اس میں روانگی نہیں ہے۔

احمد فراز زندگی سے ہارنے پر یوں کہتے ہیں کہ

قعرِ دریا میں ہیں موجوں سے جو پسپا نہ ہوئے
میں کنارے پہ جو بیٹھا ہوں تو ہارا ہوا ہوں(۱۱)

احمد فراز یہاں دریا کا استعارہ اپنے ڈوبنے یعنی کہ ہارنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں کہ ندی کی گہرائی میں موجود ہیں۔ وہ چیزیں جو کہ موجوں سے ختم نہ ہوئیں۔ میں اگر دریا کے کنارے بیٹھا ہوا ہوں تو سمجھو کہ میں ہار چکا ہوں۔ دنیا کی زندگی کو دھوکہ کہتے ہیں اور اس بارے میں کہہ رہے ہیں:

نہ کشتیاں ہیں نہ ملاح ہیں نہ دریا ہے
تمام ریگِ رواں اور سبھی سراب فروش(۱۲)

کہہ رہے ہیں کہ میری زندگی ہر چیز سے محروم ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ یہ دنیا دھوکہ ہے۔ اس میں دھوکے کے سوا کوئی چیز نہیں۔

طبیعت کی کشاکش نے ہمیں آخر ڈبونا تھا
کبھی دریا لگا اچھا کبھی ساحل پسند آیا(۱۳)

اپنی زندگی کی پریشانیوں سے مایوس ہو کر کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے ہمیں آخر ڈبونا ہی تھا کیونکہ میری طبیعت کو کبھی دریا پسند آتا ہے اور کبھی ساحل۔

ایک اور جگہ اپنے محبوب کی خوبصورتی کو بیان کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں:

کبھی اوس سے پیاس بجھائے ، تو کہیں دریا کو ٹھکرائے تو
تیرا ہنستا چہرہ اور لگے تری آنکھوں کی برکھائیں ہیں عجب(۱۴)

اپنے محبوب کے ناز و نخرے کو بیان کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ کبھی اوس کے ایک قطرے سے تیری پیاس بجھ جاتی ہے اور کہیں دریا کو بھی منہ نہیں لگاتا۔ تیرا ہنستا چہرہ اور آنکھوں سے برستی بارش عجب ہے۔

وہ اپنے عشق کی ناکامی کو بیان کرتے ہیں کہ

کسے خبر تھی کہ دجلۂ محبت میں
ہمارا ساتھ بھی موج و حباب جیسا تھا(۱۵)

کہہ رہے ہیں کہ کسے معلوم تھا کہ ہماری محبت جلد ختم ہو جانے والی ہے۔ محبت کے دریا میں ہمارے ساتھ اس بلبلے کی طرح ہے جو پانی میں بنتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔

اچھے دنوں کی امید کرتے ہیں اور رونے کے لیے دریا کا استعارہ استعمال کرتے ہیں:

"جب دھرتی صحرا صحرا تھی
ہم دریا دریا روئے تھے
جب ہاتھ کی ریکھائیں چپ تھیں
اور سر سنگیت میں سوئے تھے
تب ہم نے جیون کھیتی میں
کچھ خواب انوکھے بوئے تھے۔"(۱۶)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

اپنے خوابوں میں ناکامی کے بارے میں بیان کر رہے ہیں کہ جیسا ہم نے سوچا تھا ویسا بالکل نہیں ہوا۔

ان کے ہاں تشنگی اور دریا کا استعارہ بھی استعمال بارہا ہوا ہے کہتے ہیں:

تشنگی آنکھوں میں اور دریا میں خیال رہے
ہم نوا گر ، خوش رہے جیسے بھی حالوں میں رہے(۱۹)

کہہ رہے ہیں کہ آنکھوں میں پیاس اور دل میں دریا کے خیال رہتے ہیں۔ اپنے محبوب سے کہہ رہے ہیں کہ اے صدا دینے والے وہ جیسے بھی رہے جس حال میں بھی رہے خوش رہے۔ ان کی شاعری میں کہیں کہیں اکتاہٹ بھی محسوس ہوتی ہے اور زندگی کے لیے دریا کا استعارہ استعمال کرتے ہیں۔

یہ بے دلی ہے تو کشتی سے پار کیا اتریں
ادھر بھی کون ہے ؟ دریا کے پار کیا اتریں(۲۰)

کہہ رہے ہیں کہ زندگی بہت مایوسی کے عالم میں ہے۔ وہ زندگی سے ناامید ہیں اور کہہ رہے کہ کشتی سے اتر کر کیا کرتا۔ ادھر کوئی میرا غمگسار نہیں ہے۔ دریا کے پار بھی کیا اترتا ہے۔

اپنے دل کی بے قراری کو یوں بیان کرتے ہیں کہ

دل کبھی غم کے سمندر کا شناور تھا فرازؔ
اب تو خوف آتا ہے اک موجۂ پایاب سے بھی(۲۱)

کہتے ہیں میرا دل کبھی غموں کا استاد تھا اور اب تو تھوڑی سی بھی گہرائی آجائے سمندر میں تو ڈر لگنے لگتا ہے۔ کیونکہ اب مجھے یہ دکھ درد سہہ سہہ کر ڈر لگتا ہے کہ میں کہیں ڈوب نہ جاؤں۔ پہلے تو میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا تھا۔

احمد فراز ایک اور غزل میں دریا کا استعارہ ردیف کی طرح استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

روز کی مسافت سے چور ہوگئے دریا
پتھر کے سینوں پر تھک کے سو گئے دریا
جانے کون کاٹے گا فعل لعل و گوہر کی
ریتلی زمینوں میں سنگ بو گئے دریا
اے سحابِ غم کب تک یہ گریز آنکھوں سے
انتظار طوفاں میں خشک ہو گئے دریا(۲۲)

ابر اور دریا کو بھی اکٹھا استعمال کرتے ہیں:

خلق شبنم کے لیے دامن کشا صحراؤں میں
کیا خبر ابرِ کرم ہے صرف دریا آشنا(۲۳)

کہہ رہے ہیں کہ مخلوق ایک ایک قطرے کے لیے اپنے دامن صحراؤں میں پھلائے بیٹھی ہے لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ ابرِ کرم صرف دریاؤں سے ہی آشنا ہے۔ وہ بارش کی جستجو کرتے ہیں اور اس کے خواہش مند ہیں اور کہہ رہے ہیں:

ترسا دیا ہے ابرِ گریزاں نے اس قدر
برسے جو بوند بھی تو سمندر لگے مجھے(۲۴)

یعنی کہ بارش نہیں آتیں اور کہہ رہے ہیں کہ بارشوں نے ہمیں ترسا کر رکھ دیا ہے۔ اگر بارش کا ایک قطرہ بھی آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے دریا ہو۔

اپنے محبوب کے ہجر و وصال کی بھی بات کرتے ہیں اور اپنے دل کی کیفیت کو یوں بیان کر رہے ہیں کہ

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

ایک آنسو تھا کہ دریائے ندامت تھا فراز
دل سے بیباک شناور کو ڈبویا کیسا؟(۲۵)

اپنے محبوب سے ملنے کے بعد کی کیفیت کو بیان کر رہے ہیں کہ اسے ملنے کے بعد جو میری آنکھوں سے آنسو نکلے وہ دریائے ندامت، شرمندگی کے آنسو تھے یا میرا دل تو بہت ماہر تھا لیکن یہ ڈوب کیسے گیا۔ اس کے سامنے اپنے دکھ کیسے بیان کر دیتے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ

صرف آنکھوں سے ہی اگر دستِ کرم دیتا ہے
میری اجڑی ہوئی آنکھوں کو سمندر کر دے(۲۶)

اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ رہے ہیں کہ اے میرے خدائے بزرگ و برتر کہ تو اگر صرف آنکھوں کے سبب ہی انسانوں پر اپنا کرم کرتا ہے تو۔ میری اجڑی ہوئی آنکھوں کو بھی دریا کی طرح آباد کر دے۔

اپنے دل کے سکون کے لیے کہتے ہیں کہ

اے دل تیرے سکوں سے تری رونقیں گئیں
دریا کا سارا حسن ہی طغیانیوں میں تھا(۲۷)

اپنے دل سے شکوہ کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اے دل تیری بے سکونی کی وجہ سے تیرے چہرے کی بھی رونق ختم ہو گئی ہے۔ تیرا تو سارا حسن ہی تیرے، طاقت ور عشق میں تھا۔

ایک اور جگہ پر اپنے محبوب کے ظلم کو بیان کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ

دکھ کی دواک برساتوں سے کب یہ دل پایاب بھرا
وہ تو کوئی دریا لے آیا دریا بھی سیلاب بھرا(۲۸)

کہتے ہیں کہ ان کا محبوب ان کے لیے بہت زیادہ درد و الم کا سبب ہے۔ اس نے ان پر دریا کی کیفیت طاری کر دی اور وہ دریا بھی سیلاب زدہ جس میں سیلاب آیا ہے۔ وہ اپنے دکھ درد کو محبوب کا ظلم قرار دیتے ہیں کہ یہ سب اسی کی وجہ سے ہے۔

منیر نیازی کی ولادت خان پور ضلع ہوشیار پور میں ۹ اپریل ۱۹۲۷ء کو ہوئی۔ بعض ناقدین کے نزدیک ۱۹۲۸ء بھی ہے۔ نند کشور و کرم کی کتاب "اردو کے ۱۰۰ نامور شاعر" کے مطابق ۹ اپریل ۱۹۲۷ء بتائی گئی ہے۔

جب کہ وکی پیڈیا پر منیر نیازی کی تاریخ پیدائش ۱۹۲۸ء درج ہے۔

جب کہ ریختہ کی ویب سائٹ پر ۹ اپریل ۱۹۲۳ء درج ہے۔

محمد خالد، محمد عدنان کی کتاب "نصابِ غزل" میں ۹ اپریل ۱۹۲۸ء درج ہے اور یہی قول راجح اور متعبر ہے۔ والدین نے ان کا نام منیر احمد رکھا مگر دنیائے شاعری میں وہ منر نیازی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے والد محمد فتح خان محکمہ انہار میں ملازمت کرتے تھے مگر ابھی منیر صرف ایک برس کے ہی تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ منٹگمری (حال ساہیوال) سے میٹرک کرنے کے بعد وہ بطور سیلر نیوی میں ملازم ہو گئے مگر اس ملازمت میں ان کا جی نہیں لگا۔ لہٰذا ڈیڑھ دو سال تک ملازمت کرنے کے بعد انہوں نے ملازمت کو خیر باد کہہ کر بہاولپور کالج میں انٹر میڈیٹ میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے انٹر کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ لاہور آ گئے اور دیال سنگھ کالج سے بی۔ اے کیا۔ ہجرت کے بعد انہوں نے اپنے خاندان والوں کے ساتھ منٹگمری میں سکونت اختیار کی اور ۱۹۴۹ء میں وہاں مکتبہ ارژنگ قائم کیا۔ ان ہی دنوں ان کی ملاقات مجید امجد سے ہوئی جو بہت جلد گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ مجید امجد نے ان کی شعری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے میں غیر معمولی کردار نبھایا۔ ان کی دوستی اتنی گہری اور مستحکم ہو گئی کہ ان دونوں نے مل کر "سات رنگ" نامی رسالہ بھی نکالا جو کچھ مدت بعد دم توڑ گیا۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

۱۹۶۰ء میں انہوں نے "المثال" نامی اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ بعد ازاں وہ تلاشِ روزگار میں لاہور چلے گئے، جہاں وہ روزنامہ "نوائے وقت"، "امروز" اور "زمیندار" میں بطور کالم نویس کام کرتے رہے۔

منیر کو بچپن ہی سے شعر و ادب سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ دیال سنگھ کالج کے زمانے میں انہوں نے انگریزی میں بھی کچھ نظمیں لکھیں تھی اور ابتدائی دور میں رسائل میں کچھ افسانے بھی مگر بعد میں انہوں نے اپنے آپ کو اردو شاعری کے لیے وقف کر دیا، لیکن جب پاکستان کے صوبہ پنجاب میں مادری زبان پنجابی کو فروغ دینے کی تحریک چلی تو وہ پنجابی میں بھی لکھنے لگے اور اس زبان میں انہیں اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ آج یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ اردو کے بڑے شاعر ہیں یا پنجابی کے۔

منیر نیازی نے اردو میں ایک درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔

۱۔ دشمنوں کے درمیان شام	۲۔ تیز ہوا اور تازہ پھول
۳۔ ماہِ منیر	۴۔ آغاز زمستاں میں دوبارہ
۵۔ چھ رنگین دروازے	۶۔ سیاہ شب کا سمندر
۷۔ جنگل میں دھنک	۸۔ پہلی بات ہی آخری تھی
۹۔ ساعت سیار	۱۰۔ ایک دعا جو میں بھول گیا
۱۱۔ سفید دن کی ہوا	

ان کے علاوہ پنجابی میں بھی ان کی کئی مطبوعات منظر عام پر آئیں۔ ان کی شاعری کو روسی، انگریزی، نارویجین، جرمن اور کئی دیگر یورپی زبانوں میں شائع ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

منیر کی شاعری کی عظمت و اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں متعدد انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ جن میں ۱۹۹۱ء کا صدر کا پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ، ۱۹۹۸ء میں ستارۂ امتیاز اور ۲۰۰۲ء میں ادبیات اکادمی پاکستان کی جانب سے دیا گیا۔ "کمالِ فن" اعزاز خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

منیر نیازی اپنے دوست فلم ہدایت کار ریاض شاہد کی وساطت سے کچھ مدت فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے اور انہوں نے فلمی دنیا میں کئی یادگار گیت بھی دیے۔ منیر نیازی کی شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ فارسی کے بھاری بھر کم الفاظ سے اجتناب کرتے ہیں اور عام فہم حتیٰ کہ ہندی کے الفاظ جیسے ہولی، چتا، ابھیمان، اجالا، جگ، من، مورکھ، موہ، لوبھی، دیپ، دوارے رادھا، کومل کے حوالہ دینے سے گریز نہیں کرتے۔ منیر نیازی کی شاعری میں انسان کی خارجی کائنات اور باطنی کائنات کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

منیر نیازی کو سانس کی تکلیف ہونے کی وجہ سے لاہور کے جناح ہسپتال میں داخل کروایا گیا جہاں انہوں نے ۲۶ دسمبر ۲۰۰۶ء کو رات ساڑھے آٹھ وفات پائی۔

منیر نیازی کا شمار اردو شاعری کے ان مایہ ناز شاعروں میں ہوتا ہے۔ جن کا تذکرہ کیے بغیر اردو شاعری کو نامکمن سمجھا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں منیر کے کلام کو ابھی تک صحیح معنوں میں پرکھنے اور سمجھنے کی کوشش بہت کم کی گئی ہے۔

منیر نیازی کی شاعری دراصل حیرتوں کی شاعری ہے۔ یہ حیرت منیر نیازی کے اپنے اندر بھی ہے اور کائنات کے رگ و پے میں بھی اور یہی حیرت منیر، قاری کے اندر بھی پیدا کرتا ہے۔ ان کی شاعر کا اصل ہنر بھی یہی ہے۔ منیر نیازی خود کو انسانی معاشرے سے نکال کر جنگل کی تنہائیوں میں لے جاتے ہیں گویا اس تنہائی میں ان کو فلسفہ نفسیات، الٰہیات، جنات اور جادو کا ماحول خود بخود میسر آتا ہے۔ منیر طلسماتی علامتوں کے استعمال سے انسانی مصائب و آلام کو دیکھتا اور پرکھتا ہے۔ زمین، پہاڑ، آسمان، چاند، ستارے، دشت و دریا، وادی و کہسار، صحرا و سمندر، درخت اور جنگل وغیرہ اس کے محبوب استعاروں میں شامل ہیں۔ دریا کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

اپنی ہی تیغ ادا سے آپ گھائل ہو گیا

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

چاند نے پانی میں دیکھا اور پاگل ہوگیا(۲۹)

اس میں پانی کو بطور دریا لیا گیا ہے کیونکہ دریا پانی کا بہت بڑا منبع ہوتے ہیں۔ اس لیے پانی کا استعارہ دریا کے معنوں میں آتا ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ چاند نے خود کو پانی میں دیکھا یعنی پانی میں اپنا عکس دیکھا تو اپنی خوبصورتی دیکھ کر پاگل ہو گیا اور خود ہی وہ ایسے ہو گیا جیسے کوئی چوٹ آگئی ہو۔

دیکھا ہے اسے اس گھر میں مگر لگتا ہے منیر ایسا مجھ کو
دریا کے کنارے پر جیسے پانی میں گھر ابن دیکھا ہے

ایک اور جگہ پانی کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

زمین کے گرد بھی پانی زمیں کی تہہ میں بھی
یہ شہر جم کے کھڑا ہے جو تیرتا ہی نہ ہو(۳۰)

پانی اس اعتبار سے بہت اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں تعمیر اور تخریب دونوں پوری قوت سے چھپے ہیں۔ ایک طرف اگر یہ حیات بخش مشروب ہے جس کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ تو دوسری طرف اس میں فنا کر دینے اور مٹا دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ

دل خوف میں ہے عالم فانی کو دیکھ کر
آتی ہے یاد موت کی پانی کو دیکھ کر(۳۱)

منیر نیازی بہت سے شعروں میں معصومانہ انداز میں اپنے ارد گرد موجود اشیاء کے بارے میں سوالات بھی اٹھاتے ہیں۔ کہتے ہیں:

فغاں ہے کس کے لیے دلوں میں
خروش دریائے ذات کیا ہے(۳۲)

منیر نیازی اپنے ارد گرد موجود کائنات کو آدم اول کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اور سوالات کرتے ہیں:

اس کو کیا یادیں تھیں کیا اور کس جگہ پر رہ گئیں
تیز ہے دریائے دل اپنی روانی میں بہت(۳۳)

دریائے دل کو، دل کی دھڑکن بیان کر رہے ہیں۔ اپنے محبوب کی بات کر رہے ہیں کہ انہیں کچھ بھی یاد نہ ہو گا۔ دل اپنی روانی میں بہت تیز ہے اور بہت دور نکل چکا ہے۔

ہجرت کے تجربے نے منیر نیازی کے باطن میں ہمیشہ مرکز میں جگہ پائی ہے۔ اس لیے دریا اور پانی کے تلازمے بار بار ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ سمندر بھی اپنی جھلک منیر نیازی کی شاعری میں دیتے ہیں۔ اجڑی ہوئی بستیاں اور دیار بار بار اپنا ظہور کرتی ہیں۔ یہ سب مل کر خوف، ڈر اور بے یقینی کی کیفیات کو ابھارتے ہیں۔ منیر نیازی کو پڑھتے ہوئے بار بار یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ خوشی کا وقت رک گیا ہے۔ بار بار اپنے تجربات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں:

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں اک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا(۳۴)

یعنی کہ مشکلات ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہیں۔ وہ اس شکل سے نکلنے کی کافی کوشش کرتے ہیں مگر ناکام ہیں۔

طوفان ابر باد و بلا ساحلوں پہ ہے
دریا کی خامشی میں ڈبونے کا رنگ ہے(۳۵)

منیر نیازی متعدد الفاظ و علامات سے ایک گہری پر اسراریت اور خوف کی فضا قائم کرتے ہیں۔ دریا کی خامشی، یوں ہے کہ ڈبو دے اس لیے یہاں خوف کی فضا ہے۔

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

کونپلیں کوکیں بہت دیوار گلشن کی طرف
چاند دمکا حوض کے شفاف پانی میں بہت(۳۶)

منیر نیازی کے بہت سے شعروں میں ایک سی جھلک نظر آتی ہے کہ پانی میں چاند نے اپنا عکس دیکھا، کونپلیں کوکیں۔ اس شعر میں انہوں نے پانی کا سہارا اور عکس چاند کا دکھا کر بہت خوبصورت پیکر تراشی کی ہے۔

اچھی مثل بنتیں ظاہر اگر وہ ہوتیں
ان نیکیوں کو ہم تو دریا میں ڈال آئے(۳۷)

اپنی نیکیوں کا ذکر کر رہے ہیں کہ اگر میرے پاس بھی نیکیاں ہوتیں تو وہ زمانے کے لیے بہت اچھی مثال بن جاتیں۔ لیکن میں تو انہیں دریا میں ڈال آیا یعنی کے کہیں پھینک دیں اپنی تمام نیکیاں۔

بادل اڑے تو گم آسماں دکھائی دیا
پانی اترے تو اپنا مکاں دکھائی دیا(۳۸)

بادلوں کو بیان کر رہے ہیں کہ انہوں نے آسماں کو دور کہیں چھپا دیا تھا۔ بارش برسی کو، پانی کے استعارہ میں ملا دیا ہے کہ بارش آئی تو بادل اڑ گئے پھر آسمان دکھائی دینے لگا۔

نشان اک پرانا کنارے پہ تھا
اسے موجِ دریا بہا لے گئی(۳۹)

زمانے کی وفا کو یاد کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میں ایک نشان کی طرح اس کا وجود تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وفا کو دریا کی موجیں اپنے ساتھ بہا کر لے گئی ہیں۔ کیونکہ آج کل کسی میں وفا نہیں ہے۔

ایک اور جگہ اپنے غم کو دریائے غم کہتے ہیں:

دل کی خلش تو ساتھ رہے گی تمام عمر
دریائے غم کے پار اتر جائیں ہم تو کیا(۴۰)

کہہ رہے ہیں کہ اگر میں غم کا بہت بڑا دریا ہو اور وہ پار کر لوں تو بھی میرے غم ختم نہیں ہوں گے۔ میرے دل میں ان کی کھٹک باقی رہے گی۔

دریائے غم کے پار کا منظر یوں بیان کرتے ہیں:

شامِ فراق یارو یہی ، دشت و دروہی
دریائے غم کے پار کا منظر کچھ بھی نہیں(۴۱)

کہتے ہیں کہ جدائی کی رات بھی وہی ہے۔ آبادی اور ویرانے بھی وہی ہیں۔ غم کا دریا پار کر کے واپس آ گیا ہوں تو کوئی منظر نہیں بدلا۔ دکھ، درد ویسے کے ویسے ہیں جیسے پہلے تھے۔

سمندر کا استعارہ بھی اپنے غم کی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

ہوا شام کی آہ آوارہ تھی
ہے اس سے غم کے سمندر کئی(۴۲)

اپنے بیتے دنوں کی انہیں یاد آ رہی ہے کہ ہوا کے جھونکے ایسے آئے کہ ان سے وابستہ تمام یادیں میرے ذہن میں آ گئیں اور میرے غم کے جو سمندر تھے ان میں ہلچل مچ گئی۔

کئی جگہوں پر چیز سے مایوس ہو کر ان کو چھوڑنے کی بھی بات کرتے ہیں کہ مجھے اب کسی چیز سے کوئی لگن نہیں ہے۔ کہتے ہیں:

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

شہر ، پربت ، بحر و بر کو چھوڑتا جاتا ہوں میں
اک تماشا ہو رہا ہے دیکھتا جاتا ہوں میں(۴۴)

یہاں انہوں نے بحر و بر کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ کہہ رہیں کہ میں نے، شہر، پہاڑ، دریا سب چیزوں کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ سب میرے لیے ایک تماشائی کی طرح ہے۔ جس کو میں نظر انداز کر رہا ہوں۔

ایک اور جگہ پر بحر و بر کا ذکر یوں کرتے ہیں:

چار چپ چیزیں ہیں بحر و بر فلک اور کوہسار
دل دہل جاتا ہے ان خالی جگہوں کے سامنے(۴۵)

کہہ رہے ہیں کہ یہ چار چیزیں ہیں جو کہ خاموش ہو گئی ہیں۔ ان سے میری یادیں وابستہ ہیں۔ جب میں ان جگہوں کو دیکھتا ہوں تو میرا دل دہل جاتا ہے اور میں پریشان ہو جاتا ہوں۔

دیکھا ہے اسے اس گھر میں مگر لگتا ہے منیر ایسا تجھ کو
دریا کے کنارے پر جیسے پانی میں گھر ابن دیکھا ہے(۴۶)

اپنے محبوب کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ وہ شخص اپنے گھر میں ایسے گھرا ہوا ہے جیسے ایک جنگل، دریا کے پانی سے گھرا ہوا ہو اور دریا کا پانی جنگل کا تباہ و برباد کر رہا ہو۔

پانی کا ذکر اس طرح سے کر رہے ہیں استعارہ کے طور پر کہ

زمین کے گرد بھی پانی ، زمین کی تہہ میں بھی پانی
یہ شہر جم کے کھڑا ہے جو تیرتا ہی نہ ہو(۴۷)

کہہ رہے ہیں کہ اس زمین میں اتنا زیادہ پانی ہے۔ اس کے چاروں اطراف پانی سے گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ شہر اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس پر پانی کا کوئی اثر نہیں ہے۔

بہنے لگی ہے ندی اک سرخ رنگ مے کی
اک شوخ کے لبوں کا لعلیق ایاغ چمکا(۴۸)

کہتے ہیں کہ یوں لگتا ہے کہ ایک سرخ رنگ کی شراب کی ندی بہہ رہی ہے۔ میرے محبوب کے ہونٹ سرخ ہیں۔ یوں لگ رہا ہے کہ شراب کا پیالہ چمک رہا ہے۔

اپنے ہجرت کے واقعات کو بہت درد و الم کے ساتھ بیان کرتے کہتے ہیں:

ابر و ہوا نئے نئے ، شش و قمر نئے نئے
اہلِ نظر نئے نئے ، اہلِ خبر نئے نئے(۴۹)

کہہ رہے ہیں کہ یہاں ہر چیز یوں معلوم ہوتی ہے کہ ہر چیز نئی ہے۔ بادل کا استعارہ پانی کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ سورج چاند ستارے سب بدلے ہوئے لگ رہے ہیں۔ یہاں محبت کی نگاہ سے دیکھنے والے بھی نئے نئے ہیں۔ یہاں کا ماحول بالکل مختلف زندگی کے سماجی اور سیاسی حالات کو بھی بہت خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

چاند چڑھتا دیکھنا بے حد سمندر پر منیرؔ
دیکھنا پھر بحر کو اس کی کشش سے جاگتا(۵۰)

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

اس میں سماجی، سیاسی حالات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور سمندر کا استعارہ دریا کی لہریں جس طرح سے طغیانی میں ہوتی ہیں۔ ان کو بیان کر رہے ہیں کہ جیسے چودھویں کا چاند اپنے جوبن پر ہوتا ہے ویسے ہی دریا میں بھی لہریں بننا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس میں چاند کے مدوجزر کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

1. احمد فراز، کلیاتِ احمد فراز، نئی دہلی: فرید بک ڈپو، ۲۰۱۰ء، ص ۹۵
2. ایضاً، ص ۹۵
3. ایضاً، ص ۱۹۲
4. ایضاً، ص ۲۰۰
5. ایضاً، ص ۲۰۸
6. ایضاً، ص ۳۸۱
7. ایضاً، ص ۴۵۵
8. ایضاً، ص ۴۷۸
9. ایضاً، ص ۴۹۳
10. ایضاً، ص ۵۱۰
11. ایضاً، ص ۵۲۱
12. ایضاً، ص ۵۲۲
13. ایضاً، ص ۵۳۷
14. ایضاً، ص ۵۵۹
15. ایضاً، ص ۵۷۱
16. ایضاً، ص ۵۹۸
17. ایضاً، ص ۶۱۷
18. ایضاً، ص ۶۳۵
19. ایضاً، ص ۶۴۴
20. ایضاً، ص ۷۶۱
21. ایضاً، ص ۸۹۱
22. ایضاً، ص ۹۱۳
23. ایضاً، ص ۹۱۵
24. ایضاً، ص ۱۰۲۱
25. ایضاً، ص ۱۰۲۷
26. ایضاً، ص ۱۱۰۳
27. ایضاً، ص ۱۱۵۷
28. ایضاً، ص ۱۱۷۷
29. منیر نیازی، کلیاتِ منیر، لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱
30. ایضاً، ص ۲۴
31. ایضاً، ص ۳۵
32. ایضاً، ص ۳۷

ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol. 5 No.3 2021

33. ایضاً، ص۱۴۹
34. ایضاً، ص۱۷۷
35. ایضاً، ص۱۸۱
36. ایضاً، ص۲۰۳
37. ایضاً، ص۲۱۳
38. ایضاً، ص۲۷۹
39. ایضاً، ص۳۱۰
40. ایضاً، ص۳۴۹
41. ایضاً، ص۳۹۱
42. ایضاً، ص۴۰۱
43. ایضاً، ص۴۲۴
44. ایضاً، ص۴۲۷
45. ایضاً، ص۴۷۱
46. ایضاً، ص۴۸۹
47. ایضاً، ص۴۹۹
48. ایضاً، ص۵۱۳
49. ایضاً، ص۵۳۴
50. ایضاً، ص۵۹۴